منطق الطیر قدیم وجدید کا تقابلی مطالعہ

COMPARISON OF OLD AND NEE MANTIQ UL TAIR

ڈاکٹر ناہید قمر[1]، ڈاکٹر زینت افشاں**

Abstract:

Mantiq-Al-Tayr, Farid Ud Din Attar's great mystical poem (12th C) is a magnificent allegorical tale about the soul's search for meaning; where the journey entails over the valleys of Quest, Love, Knowledge Detachment, Unity, Wonderment and Annihilation. At the end, the self disappears into the universe, becoming timeless. Mustansar Hussain Tarrar's latest Novel Mantiq-al-Tayr Jadeed embarks on an allegorical journey to deal with issues of religious interpretation, updating a classic of world literature by voicing his fascination with Attar. The only difference is, while Attar was allegorical about the journey and the destination, using the birds to underline the equation between the Creator and His creations, Tarar's birds besides their quest, also carry the massive burden of being representatives of the celestial revelations. This article presents a critical study of common grounds of narrative, style and themes of both the master pieces.

کلیدی الفاظ: فریدالدین عطار، مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، تصوف، جاوید نامہ۔

فریدالدین عطار کی "منطق الطیر" عالمی ادب کی ان بنیادی کتابوں میں سے ایک مانی جاتی ہے جن کے اثرات کا دائرہ اپنے ملک اور زبان سے بڑھ کر دنیا کی دیگر زبانوں اور علاقوں میں بھی پہنچا ہے جن سے اس نظم اور اس کی تہذیبی روایت کا براہِ راست تعلق بنیں ہے۔ اس نظم کی مرکزی علامت پرندوں کی تلاش اور اس کے ارد گرد قائم علامتی ڈھانچے کی باز گوئی زمانہ قدیم سے لے کر آج کے جدید دور تک یوں ہوتی آئی ہے جیسے یہ پوری انسانیت کا فکری اثاثہ ہوں۔ اس قصے سے متعدد ادیب و شاعر اپنی تخلیقی واردات کے بیان کے لیے ایسا ڈھلا ڈھلایا سانچہ حاصل کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور اس طریقے سے نظم کے امکانات و معنی کے نت نئے پہلو بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ کلاسیکی ادب کی ایک تعریف جو دورِ جدید کے افسانہ نویس اتالو کالوینو (Cuba-1923) نے اپنے مضمون "کلاسیک کیوں پڑھیں"؟ میں بیان کی، کہ یہ ہے کہ چاہے ہم اسے بھول جانے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ اپنے بیج ہمارے اندر چھوڑ جاتا ہے، پھر ان بیجوں سے کبھی نہ کبھی اکھوے پھوٹنے لگتے ہیں۔[(1)] شاید یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں بھی متعدد تخلیق کاروں کو "منطق الطیر" کی کہانیوں میں اپنے اپنے تجربے و تلاش کا عکس نظر آیا ہے اور لوگوں نے اس کے چراغ سے اپنے چراغ جلائے ہیں جو ثبوت ہے اس بات کا کہ اس نظم کا زمانہ ختم نہیں ہوا اور ان پرندوں کا سفر ابھی جاری ہے۔ ایک ایسا سفر جس میں پرانی کہانیاں نئی ہو جاتی ہیں اور معنی کی کوئی نئی جہت سامنے آجاتی ہے۔ اُردو فکشن میں عطار کی اس نظم سے جلائے گئے تین اہم چراغوں میں سے ایک فہمیدہ ریاض کا افسانہ "قافلے پرندوں کے" دوسرا بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" اور تیسرا مستنصر حسین تارڑ کا ناول "منطق الطیر جدید" ہے۔ اول الذکر میں پرندوں کے سفر کی علامت کو عصری مسائل کے بیان کے لیے بروئے کار لایا گیا ہے۔ ثانی الذکر میں

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد

** شعبہ اردو، فیڈرل اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

پرندوں کی تلاش عشق کی معنویت اور انسانی فطرت پر اس کے اثرات جاننے کے لیے ہیں۔ جبکہ مؤخر الذکر ناول میں پرندوں کی تلاش کے مرکزی بیانیے کو ہی ناول کے پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر دونوں تصانیف کا تقابلی مطالعہ مستنصر حسین تارڑ کے فکری نظام کو توضیح اور عطار کی نظم کی تفہیم کا ایک نیا اور دلچسپ زاویہ فراہم کر سکتا ہے۔ ذیل میں دونوں تصانیف کا تعارف درج کرتے ہوئے ان کے اسلوبیاتی اور موضوعاتی مشترکات اور اختلافات کا جائزہ لیا جائے گا۔

منطق الطیر (قدیم)

خواجہ فرید الدین عطار فارسی زبان کے معروف صوفی شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش ایران کے شہر نیشاپور میں 1145 میں ہوئی۔ پورا نام ابو حامد یا محمد علی ابی بکر ابراہیم بن مصطفیٰ عباس ہے۔ فرید الدین لقب اور ابو حامد کنیت ہے۔ عطار کے نام سے معروف ہونے کا سبب ان کا آبائی پیشہ عطر فروشی ہے۔ اہم تصانیف میں تذکرۃ الاولیا، منطق الطیر، الٰہی نامہ، مظہر العجائب، لسان الغیب، خسرو نامہ اور پند نامہ شامل ہیں۔ منطق الطیر عطار کی 4600 اشعار پر مشتمل تمثیلی مثنوی ہے جس میں راہِ سلوک کے مختلف مراحل پر علامتی پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ فارسی ادب میں تصوف کے موضوع پر حکیم سنائی کا حدیقہ، مولانا روم کی مثنوی اور فرید الدین عطار کی منطق الطیر اہم ترین تصانیف شمار ہوتی ہے۔

منطق الطیر میں عطار نے سیمرغ کی تلاش (جو کہ در حقیقت حقیقتِ مطلقہ کی تلاش ہے) میں نکلنے والے پرندوں کو تصوف کی سات وادیوں یا منازل سے گزرتے ہوئے دکھایا ہے جس کا بیان انہتائی اثر انگیز ہے۔ تلاش و جستجو کے اس سفر میں یہ تیس پرندے جب سیمرغ کے دربار میں پہنچتے ہیں تو انھیں علم ہوتا ہے کہ وہ تو خود ہی سیمرغ ہیں۔ عطار نے یہاں وحدت الوجود اور فنا کے بعد بقائے دوام کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ اس مقام پر سالک عالمِ وحدت کا ایک جزو بن جاتا ہے یعنی فنا الفنا۔ عطار نے سلوک کی ان سات منازل کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے فقر کے اوصاف درج کئے ہیں۔

> ''فقیری کے کعبہ کی طرح چار ستون ہیں اور پانچواں ستون سوائے خدا کی ذات کے نہیں ہے۔ فقیری کے چار اوصاف بھوک، جوانمردی، ذلت اور غریب الوطنی ہیں۔''(2)

اس کے بعد سات منازل کی تفصیل درج کی گئی ہے:

> ''جب تو وادی طلب میں داخل ہوگا۔ تیرے سامنے ہر وقت ایک نئی مشکل پیش آئے گی۔۔۔ اس وادی میں دنیا کی تمام چیزیں ترک کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے بعد وادی معرفت آئے گی، جہاں ہر شخص کو قرب کا درجہ اس کا کمال دیکھ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وادی استغنا آتی ہے۔۔۔ وہاں بے نیازی کی ہوا چلتی ہے جہاں بہشت اور دوزخ کوئی معنی نہیں رکھتی۔
>
> اس کے بعد وادی توحید آئے گی جو اکیلے رہنے کی منزل ہے، یہاں عناصرِ اربعہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وادی حیرت آتی ہے جہاں ہمیشہ حسرت و یاس سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہر سانس یہاں تلوار کی طرح زخم لگاتی ہے اور ہر گھڑی رنج و افسوس ہوتا ہے۔
>
> اس کے بعد فقر و فنا کی وادی ہے۔۔۔ یہاں پہنچ کر انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔''(3)

جب راستے (یا تصوف کی اصلاح میں تربیت و مجاہدہ) کی سخت مشکلات سے گزر کر تیس پرندے منزل پر پہنچتے ہیں (کہ باقی تمام راہ کی سختیوں کی نذر ہو گئے) تو انھیں اس امر کا ادراک ہوتا ہے کہ وہ خود ہی سیمرغ ہیں۔ یعنی ریاضت و مجاہدہ سے گزرنے کے بعد وہ خود ہی سیمرغ نکلے۔ یہی فنا کی منزل ہے کہ وہ تیس پرندے سیمرغ کی ذات میں فنا ہو گئے۔ جب انھوں نے اپنی فانی ذات سے قطع تعلق کر لیا تو انھیں بقا حاصل ہو گئی۔ یعنی جب تک انسان وجود و عدم کے مسائل میں الجھا ہوا ہے، بقا کے راستے پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ جب اس کے اندر سے وجود اور عدم کے سوالات

ختم ہو جاتے ہیں تب اسے بقا کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے خدا بندے کو آزماتا ہے پھر اسے بڑا مرتبہ عطا کرتا ہے۔ موتو قبل ان تموتو کا مفہوم یہی ہے کہ پہلے خود کو فنا کرتا کہ تجھے ہستی عطا ہو۔

بقول سہیل احمد خان:

اپنے آپ کو دیکھا تو خود اس کی تصویر بنے
اپنے عکس کی یکتائی میں تیس پرندے ڈوب گئے (4)

منطق الطیر (جدید)

مستنصر حسین تارڑ معاصر اُردو فکشن کا اہم ترین نام ہیں جن کے قلم سے متعدد تصانیف سفر ناموں، ڈراموں، افسانوں اور ناولوں کی شکل میں تخلیق ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے اہم ناولوں میں بہاؤ، راکھ، قربتِ مرگ میں محبت، خس و خاشاک زمانے، اے غزالِ شب اور منطق الطیر جدید شامل ہیں۔ ان کا زیر جائزہ ناول منطق الطیر جدید تو عطار کی نظم کی ایک توسیع شدہ صورت ہے ہی لیکن منطق الطیر قدیم ایک تخلیقی محرک کے طور پر ان کے دیگر ناولوں کے پس منظر میں بھی موجود رہی ہے۔

''میں ان میں سے ایک ہوں جو سیمرغ کی تلاش میں دربدر ہوئے تھے اور ہم یقین، تلاش، پیار، آزادی، وصال، حیرانی و غربت اور موت اور عدم وجود کی سات وادیوں میں سے گزرے اور۔۔۔ اس سفر میں۔۔۔ ہم تیس بچے تھے۔۔۔ پردہ اٹھا تو وہاں بھی ہم تھے۔۔۔ ہم خود ہی سچ تھے۔''(5)

''منطق الطیر جدید'' کے آغاز میں مولانا روم کا یہ قول درج ہے کہ عطار عشق کے سات شہروں سے گزرا جب کہ میں ابھی پہلی گلی کے موڑ پر ہوں۔ اس کے ساتھ سچل سرمست کا یہ بیت درج ہے:

میرا یالا کھوں میں ایک ہے
عارف ہے اور عاشق ہے اور نام عطار ہے
تو بھی اگر عشق کرنا چاہے تو
وصلت نامہ اور منطق الطیر سن لے (6)

ناول کا مرکزی کردار موسیٰ حسین ہے جو ایک مصور ہے اور ناول کی کہانی میں یہ جستجو اور عشق کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اسی کردار کے گرد بیانیے کی مختلف پرتوں کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ موسیٰ حسین اولاد کے حصول کی خواہش میں اپنی ساری روشن خیالی ترک کر کے ئلہ جوگیاں کے مقام پر ان پرندوں سے ملتا ہے جو اپنے اپنے زمانے کا سفر کر کے یکجا ہوئے ہیں۔

''ان میں سے ایک پرندہ ہے جو کپل دستو کے شہزادے گوتم کے دھیان میں گم فاقہ کش بدن کی پسلیوں میں گھونسلہ بنا کے بیٹھا تھا۔ ایک عیسیٰ کی صلیب سے نمودار ہونے والا پرندہ جس نے ابنِ مریم کے جسم کے پیاسے ہونٹوں پر پانی کی بوندیں ٹپکائی تھیں۔ ایک پرندہ غارِ حرا کے شگافوں میں مقیم تھا جس نے نبی آخر الزماں ﷺ پر پہلی وحی اترتے دیکھی۔ ایک پرندہ بلخ کے آتش کدوں کی راکھ میں مقیم تھا جس نے زرتشت کے ادنی لبادے کے اندر روپوش ہو کر خود کو زندہ رکھا۔ قرۃ العین طاہرہ کو جس کنویں میں ڈالا گیا اس کنویں میں مقیم پرندہ، حلاج کی دجلہ میں بہائی گئی راکھ سے جنم لینے والا پرندہ۔۔۔ وہ پرندہ جس کا گھونسلہ کرشن کی بانسری کے سوراخوں میں تھا۔''(7)

موسیٰ حسین زمین سے جڑا ہوا کردار ہے۔ ناول کے اختتام پر پرندوں کے اجتماع میں جب موسیٰ اور پرندوں کے مابین مکالمہ ہوتا ہے تو موسیٰ کہتا ہے کہ میرا بیج اسی دھرتی سے پھوٹا ہے میں اس دھرتی کا آدمی ہوں۔ مصنف کے دیگر ناولوں کے کچھ کرداروں کی طرح اس کردار میں بھی

مصنف کی اپنی شخصیت کی بازگشت موجود ہے۔ایک اعتبار سے موسیٰ کا کردار مصنف کے بیانیے کا عکس تھا۔

''ہم سب پرندوں کو عطار نے ایک ہی ڈور میں باندھ دیا ہے۔ گوہِ طور، بیت اللحم اور حرا کی غار ایک ہی بندھن کے تسلسل کے پرندے ہیں۔''(8)

ناول میں پرندوں کو جن تاریخی شخصیات کے علامتی مظہر کے طور پر پیش کیا گیا ہے ان میں بھرتری ہری، قرۃ العین طاہرہ، حسین بن منصور حلاج اور گوتم بدھ کے علاوہ میرا بائی، بلھے شاہ، سچل سرمست، میاں محمد بخش، مولانا روم، اقبال، بابا فرید، زرتشت، شاہ حسین، گرونانک، شمس تبریز اور وارث شاہ شامل ہیں۔ طور کا پرندہ، بدھ کا پرندہ، قرۃ العین طاہرہ کا بہائی مذہب کا پرندہ اور بندرابن کا پرندہ مختلف عقیدوں اور مذہبی سچائیوں کی علامات ہیں۔ جبکہ دیگر شخصیات کا حوالہ عشق کی اس جہت کی نمائندگی کرتا ہے جو روحانی تجربے کا حصہ ہونے کے باوجود ناقابلِ ترسیل ہے۔ ہیر، سوہنی اور صاحباں زمینی عشق کے پرندے ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عشقِ حقیقی کو اپنی تکمیل کے لیے عشقِ مجازی ہی سے گزر کر جانا ہوتا ہے۔

ناول کے ایک اہم علامتی کردار حسین بن منصور حلاج کا تصوف کی تاریخ میں نمایاں مقام ہے۔ (858۔922) عباسی خلفا کے عہد اور قدیم بغداد کے فکری و روحانی ماحول میں حلاج کے نظریات خصوصاً انا الحق کے نعرے نے ہلچل پیدا کر دی تھی اور اہل طریقت میں ایک ایسی نامختتم بحث چھڑی کہ صوفیا کے ایک گروہ کے نزدیک اگر وہ زندیق تھا تو دوسرے اسے رموزِ حق کا آشنا سمجھتے تھے۔ حلاج کا کردار دراصل صوفیانہ تجربے کی اس جہت کی نمائندگی کرتا ہے جس میں حصولِ معرفت کے لیے صوفی اپنے آپ کو تمام ارضی حوالوں سے آزاد کر کے فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

بدھ (4thto5thBC) کو انسانی تاریخ میں ایک فلسفی اور بدھ مذہب کے روحانی رہنما کا مقام حاصل ہے۔ بدھ نے بادشاہت کا عیش و آرام ترک کر کے عرفان اور سکونِ قلب کے حصول کے لیے ریاضت اور تفکر کا راستہ اختیار کیا اور انسانوں کو بتایا کہ نروان (نجات) دنیاوی لذتوں سے خود کو آزاد کرنے اور صعوبت و ابتلا کے ذریعے روح کو تقویت پہنچانے سے ملتا ہے۔

زرتشت ایک قدیم ایرانی روحانی رہنما ہے جس نے زرتشتی مذہت کی بنیاد رکھی جو دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ایک ہے۔(ان کے دور کے بارے میں حتمی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔تاہم مؤرخین کے خیال میں یہ دوسری صدی قبل مسیح کا دور ہو سکتا ہے)۔

قرۃ العین طاہرہ (1814تا1858) اصل نام فاطمہ برانمانی ایک اہم شاعرہ، حقوقِ نسواں کی علمبردار اور بابی/بہائی مذہب کی نمائندہ ایک متحرک شخصیت ہیں۔ طاہرہ نے ملوکیت کے خلاف عوام الناس کا شعور بیدار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

بھرتری (6thC)، راجہ چندر سین کا شاعر، فلسفی اور ماہر لسانیات کا بیٹا۔۔۔جو جاوید نامہ (علامہ اقبال 1876تا1938) میں بھی ایک کردار کے طور پر موجود ہے۔ منطق الطیر جدید میں بھرتری ہری کے شعر "پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر" کا حوالہ دیا گیا ہے اور جاوید نامہ کا بھی۔

'جاوید نامہ' کا ذکر آیا ہے تو یہاں اس دلچسپ نکتے کی نشاندہی کرنا بے جا نہ ہوگا کہ "جاوید نامہ" جو علامہ اقبال کا اہم ترین تخلیقی شاہکار ہے، 'منطق الطیر جدید' کے کچھ اہم علامتی کردار "جاوید نامہ" میں بھی کم و بیش اسی فکری پس منظر کے ساتھ سامنے آتے ہیں جن میں سے بھرتری ہری کا حوالہ پیچھے دیا جا چکا ہے۔ دو اہم کردار حسین بن منصور حلاج اور قرۃ العین طاہرہ کے ہیں جنھیں اقبال نے فلکِ مشتری پر غالب کی روح کے ساتھ دریافت کیا ہے۔ ان تینوں نے بہشت میں سکون اور طمانیت سے معمور قیام پر ایک روحانی اضطراب اور گردشِ جاوداں کو ترجیح دی تھی۔ ان کی فکر کے زاویے الگ الگ ہیں لیکن ایک وصف جو ان میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، وہ اپنے اپنے زمانے کے عام چلن سے دوری کا ہے۔ یہ

قیام کے بجائے سفر کے نمائندے ہیں۔ سفر جو ارتقااور تقلیب کی علامت ہے۔اپنے اپنے سوالوں میں گھرے یہ تینوں خود کو اپنے باطنی اضطراب میں دریافت کرتے ہیں۔تاہم حلاج اور طاہرہ سے قطع نظر، غالب کو اقبال تخلیقی تفکر کے ایک معیار کے علاوہ ایک شخصی آدرش کے طور پر بھی دیکھتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر اور جاوید نامہ کے فکری منابع کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ "جاوید نامہ" کے پر جلال آفاقی ڈرامے میں زمین سے لے کر ایک طویل سیر الافلاک میں اقبال کی تخلیقی بصیرت جن مراحل سے گزرتی ہے وہ مثنوی مولانا روم کا تکملہ ہے اور مثنوی مولانا روم کے فکری آفاق میں ایک بڑااور اہم حصہ منطق الطیر کا ہے۔ گویا یہ روشن فکری کی ایک ہی روایت کی کڑیاں ہیں۔

منطق الطیر جدید میں پرندوں کے علامتی قالب میں پیش کی جانے والی زیادہ تر شخصیات میں مختلف مذاہب یا عقائد کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اور قدرِ مشترک بھی امتیازی وصف کی حیثیت رکھتی ہے کہ ان سب نے اپنے اپنے عہد کے غالب بیانیے کو چیلنج کیا اور تفکر کا ایک نیا راستہ کھولا۔

منطق الطیر قدیم و جدید کی موضوعاتی مماثلت

دونوں تصانیف کا نقطہ اشتراک وحدۃ الوجود کا فلسفہ ہے۔ بعض فقہا کے خیال میں اس فلسفے کا آغاز محی الدین ابن عربی (1165 تا Spain,Syria.1240) کی "فصوص الحکم" سے ہوا اور بعض کے نزدیک شیخ عبدالقادر جیلانی (1078 تا Iran1166) کی "فتوح الغیب" میں یہ مباحث پہلے بیان ہو چکے تھے۔اس مسئلے پر دیگر اہم تصانیف میں مولانا جامی (1796 تا Afghanistan.1861) کا رسالہ فیض الموجود اور صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی کا کلمۃ الحق وغیرہ اہم ہیں۔ابنِ عربی کے مقلدین میں مولانا روم بھی شامل ہیں۔ وحدت الوجود کے ماننے والوں کا مسلک یہ ہے کہ ظاہر و باطن خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ یہ دکھائی دینے والا عالم جو خدا کا غیر محسوس ہوتا ہے اور جسے "ماسوا" کہتے ہیں، ماسوا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہی مظہر ہے۔اس ضمن میں ابنِ عربی کا مشہور قول ہے "الحق محسوس والخلق معقول" یعنی جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ سب کچھ حق ہی ہے البتہ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں وہ مخلوق ہے، تاہم ابنِ عربی سے قبل فرید الدین عطار اور نظامی گنجوی (1141 تا 1209) بھی اپنے اشعار میں وحدۃ الوجود کا حوالہ دے چکے تھے۔

اختلافات

1۔ زیرِ جائزہ دونوں تصانیف اسلوبیاتی مماثلت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر منطق الطیر قدیم میں حکایاتی اسلوب کے پیرایے میں بات کی گئی ہے جبکہ منطق الطیر جدید کے اسلوب میں بیانیے کی تبدیلی کے ایک سے زائد تجربات کئے گئے ہیں جن میں سے ایک اہم تجربہ یہ ہے کہ منطق الطیر جدید میں ایک مقام پر منطق الطیر قدیم کو ایک او پیرا کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں تیرہ (13) کردار ہیں۔ ہد ہد، قمری، طوطا، تیتر، شہباز، دراج، بلبل، مور، چکور، کبوتر، فاختہ، عقاب اور سنہری مچھلی۔انسان کرداروں کی علامتی معنویت ان کے تعارف سے واضح ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ہدہد حضرت سلیمانؑ کا قاصد تھا۔ قمری کوہِ سینا پر گھونسلہ بنا کر بیٹھی تھی، طوطا جنت کے ایک شجر میں قیام کرتا ہے، تیتر دانش کے پہاڑ سے اترنے والا پرندہ ہے۔ شہباز وحدانیت کے غار میں قیام کرنے والا، دراج جنت کے آسمان کا پرندہ، بلبل محبت کے باغ میں بسیرا کرنے والی، مور جنت کے آٹھ دروازوں والے باغ کا مقیم، چکور اندھے کنویں کا قیدی، کبوتر انا کی مچھلی کا سر کچلنے والا، فاختہ آگہی کی مسافر، عقاب صراطِ مستقیم سے آشنا اور سنہری مچھلی فنا الفنا کا مقام۔[9] ادب میں پرندے کی علامت ابدی زندگی کے ساتھ ساتھ زمین اور آسمان کے درمیان رابطے کا مفہوم بھی رکھتی ہے اور یہاں بھی منطق الطیر یعنی پرندوں کی زبان کا مفہوم وجود کے اعلیٰ درجوں سے منسلک ہے۔

2۔ منطق الطیر جدید میں منطق الطیر قدیم سے ایک اسلوبیاتی اختلاف Poetic Shorthand کی صورت میں آتا ہے۔ ناول میں کئی مقامات پر مصنف نے متعدد شعرا کے بہت سے اشعار یا شعر کے کسی ایک مصرعے کو اس طرح بیانیے کا حصہ بنایا ہے کہ خیال کا وہ نکتہ جس کی تفصیل درج کرنے میں کئی صفحات صرف ہو سکتے تھے، وہ چند الفاظ میں بیان ہو گیا ہے۔ Poetic Shorthand کی تکنیک استعمال کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اس سے نہ صرف عبارت کی تاثر انگیزی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے بلکہ جس شعری متن کو بروئے کار لایا جائے، اس کے پرت در پرت سلسلہ ہائے معنی سے استفادے کی صورت بھی میسر آجاتی ہے۔ منطق الطیر جدید سے اس تکنیک کے استعمال کی چند مثالیں دیکھئے:

1۔ زندگی سے ڈرتے ہو (ن م راشد)[10]

2۔ خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد (فیض)[11]

3۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر (بھر تری ہری)[12]

4۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے (غالب)[13]

5۔ شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نیں ڈرنا (میاں محمد بخش)[14]

6۔ دلِ عاشق کی خبر لینا (میر تقی میر)[15]

7۔ روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام (حسرت موہانی)[16]

3۔ منطق الطیر جدید کے اسلوب کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تین حوالوں سے مصنف کے ایک اور اہم ناول "راکھ" کے بیانیے کی بازگشت بھی ملتی ہے۔ پہلا حوالہ گندھارا تہذیب سے دلچسپی کا ہے۔

"فاہیان کے بقول صرف وادی سوات میں سولہ ہزار بدھ خانقاہیں تھیں جن میں ہزاروں بھکشو دنیا بھر کے علوم کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔"[17]

دوسرا حوالہ تاریخ کو ایک فریب قرار دینے کا ہے جو "راکھ" کے بیانیے کا ایک اہم نکتہ تھا۔ زیرِ جائزہ ناول میں بھی تاریخ کے ضمن میں مصنف کا یہی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔

"تاریخ، نصابوں، کتابوں، مخطوطوں اور صحیفوں میں جتنی بھی درج ہوئی، دراصل تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔۔۔ تاریخ، تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"[18]

مستنصر حسین تارڑ کا یہ فکری رویہ تاریخیت کا رجحان لیے ہوئے ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خان اور محمد سلیم الرحمٰن کا یہ بیان غور طلب ہے:

"ادب کسی بھی دور کا ہو، اس کا جائزہ لیتے وقت اس دور کے تصورات و رسمیات اور نقطہ ہائے نظر کا سیاق و سباق سامنے رہنا چاہئے۔ اعلیٰ درجے کے ادب کو کسی خاص عہد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ہر ادیب اور شاعر اپنے دور کی مخصوص معاشرتی فضا اور مخصوص عقلی رویوں کے تحت ادب تخلیق کرتا ہے اور اس فضا یا رویوں کا عکس کسی نہ کسی حد تک اس کی تحریروں میں دکھائی بھی دیتا ہے۔ یہی تاریخیت ہے۔"[19]

اس فکری رویے کو بروئے کار لا کر مصنف نے "منطق الطیر قدیم" کے علامتی ڈھانچے سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان علائم میں عصری حسیت کی شمولیت سے نہ صرف ان کا معنوی Spectrum بڑھا دیا ہے بلکہ بین السطور یہاں نو تاریخیت کی اہمیت کا بھی احساس دلایا ہے کہ

کسی عہد کے ادبی متون کی تفہیم کے لیے اس عہد کے متبادل بیانیوں یعنی غیر ادبی متون سے استفادہ ناگزیر ہوتا ہے۔

''منطق الطیر جدید'' میں ''راکھ'' کے بیانیے کی بازگشت کا تیسرا حوالہ ایک مخصوص جملے کی گردان ہے، جو راکھ میں تقریباً ہر اس مقام پر آیا ہے جہاں کہانی میں کوئی اہم موڑ آنا ہو۔ اس جملے کی حیثیت فلیش بیک کی سی ہے۔

''چار چیزیں تھیں جو اسے ہر دسمبر میں بلاتی تھی، قادر آباد کی جھیل پر اترنے والی مرغابیاں، وادی سوات کا ایک سلیٹی منظر، کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا دریائے راوی اور چوک چکلہ۔''(20)

''منطق الطیر جدید'' میں ناول کا آغاز ''راکھ'' کے اسی جملے سے ہوتا ہے۔ منطق الطیر قدیم و جدید کے موضوعات اور اسلوب میں مماثلت اور اختلافات کے اس جائزے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ ناول کا اختتام کس پیرایے میں کیا گیا ہے۔ ناول کے اختتام پر جستجو کے سفر پر نکلنے والے آٹھ پرندے جب عشق کے تین پرندوں سے ملتے ہیں تو ان میں ایک تبدیلی جنم لیتی ہے۔ عشق کے پرندے خود کو فنا کر کے انھیں مکمل کر دیتے ہیں۔

''آٹھوں کے سامنے وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے آمنے سامنے اور ان کی آنکھوں میں جستجو کے جگنو ٹمٹماتے تھے۔ عشق آتش بھڑکتی تھی۔ معرفت کی لو ایک اگربتی کی مانند سلگتی تھی۔ بے نیازی کی بے اعتنائی کی بے رخی تھی۔ توحید کی یکتائی کن فیکون کہتی تھی۔ حیرت کے جہان اندر جہان تھے اور فنا کی تاریکی کا بلیک ہول تھا جس میں داخل ہونے والا اپنی کائنات میں لوٹ نہیں سکتا تھا۔ بلیک ہول کے خاتمے پر ایک اور کائنات کی ہمیشگی میں ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہی وہ سات وادیاں تھیں جنھیں پار کر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے۔''(21)

جذبہ عشق کی آمیزش سے وقوع پذیر ہونے والی اس تقلیب کا بیان بہت اثر انگیز ہے۔ ناول کے اختتام پر مرکزی کردار موسیٰ حسین خود کو پرندے کے قالب میں تبدیل ہوتا محسوس کرتا ہے۔ پرندے کے قالب میں آنا روح کے درجات میں تبدیلی اور ارتقاء کی علامت ہے۔

''تبدیلی ہئیت کے یہ کرشمے ازل سے کائناتوں کے ظہور سے پہلے کن فیکون سے ایسے انسانوں کو ودیعت کئے جاتے ہیں جن میں معمول سے روگردانی کی سکت ہوتی ہے۔ سلگتی جھاڑی میں سے کلام کرنے والے کی آواز سن کر بھی ہوش میں رہنے کی، میخوں سے ٹھونکے جانے کے باوجود برداشت اور صبر کی، طائف کے باغ میں انگور کی ایک بیل کے سائے میں پناہ لیتے خون آلود پاؤں والے کی بددعا نہ دینے کی سکت۔ یہ وصف روزِ ازل سے بقیہ خدائی سے الگ تخلیق کیے جانے والے انسانوں میں بھرا ہوتا ہے اور ان لمحوں جب وہ جبلِ طور پر قدم رکھتے ہیں۔ یروشلم کی گلیوں کے پتھروں پر اپنی صلیب گھسیٹتے ہیں، جبلِ نور پر چڑھتے ہیں تو ان کے اندر بھی ایک تبدیلی جنم لیتی ہے۔ وہ وہ نہیں رہتے جو کہ وہ تھے۔۔۔ یہ نوازے گئے لوگ ہوتے ہیں۔''(22)

تبدیلی قالب، مشرقی داستانوں کی ایک اہم اور مستقل واردات رہی ہے۔ جس طرح کسی کردار کا پتھر ہو جانا تلاش و جستجو کے سفر میں ناکامی کی علامت ہے۔ اس طرح یہاں موسیٰ حسین کا پرندے کے قالب میں آنا اس کی جستجو میں کامیابی کا مظہر ہے جو تربیتِ نفس کے مراحل طے کئے بغیر ممکن نہیں لیکن اس مقام پر یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ فرید الدین عطار کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے بنیادی مطمع نظر سے مختلف تجربہ اور زاویہ نظر رکھنے والے ادیبوں کی فکر کو بھی مہمیز فراہم کرتا ہے۔ منطق الطیر قدیم کے برعکس مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول کا اختتامیہ Open-Ended رکھا ہے۔ یہ انجام روحانی تکمیل اور معنی کی علامتی پیکر تراشی سے اجتناب کی نشاندہی کرتا ہے۔ سفر کے بعد مزید سفر، اپنی تلاش جس کی معنویت اسی تلاش میں مضمر ہے۔ خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ راستہ ہی راستہ ہے۔ ہر پرندے کے لیے اپنی سمت۔

''موسیٰ نے ان سب کے آنسو پونچھے اور کہا یہ ہماری آخری ملاقات تو نہیں ہے۔۔۔ کہ بقول عطار سچ ایک ہی مقام پر توازن نہیں ہوتا، اس کے پڑاؤ بدلتے رہتے ہیں۔ تو آج کا سچ بھی کبھی نہ کبھی اپنی ہئیت بدلے گا اور جیسے آٹھ نو سو برس بعد تم سب سچ کے ایک اور عکس کو متشکل دیکھنے کی جستجو میں حائل بہ پرواز ہوئے تو آج سے کون جانے کتنے ان گنت برسوں کے بعد تم پھر اپنے اپنے آشیانوں سے نکلو گے تب ہم

ایک مرتبہ پھر آمنے سامنے ہوں گے۔ ان زمانوں کے کسی جبل طور پر، جبلِ نور پر، ٹلہ جوگیاں پر، تو تب ملاقات ہو گی، ہم دوبارہ ملیں گے۔"(23)

شاید ہم سب عطار کے پرندے ہیں اور ہر پرندے کو تلاش کا دائرہ مکمل کر کے خود تک پہنچنا ہے کہ اس کے بغیر حقیقت اولی تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ منطق الطیر قدیم ہو یا جدید، اس میں اس دنیا کے تمام پرندے، صبحِ ازل سے ابد آباد تک کے سب پرندے موضوع ہیں۔ مصنف اپنی روحانی روایت سے منسلک ہے اور یہ روایت اس کی فکری، جذباتی اور روحانی احتیاج کی تسکین کا باعث ہے۔ روشن فکری اور فیضانِ روحانی کا یہ تالاب سوکھنا نہیں چاہئے اور نہ ہی اس کے سوکھنے کا کوئی امکان ہے کہ اس میں رہر لحظہ نیا پانی شامل ہوتا رہتا ہے اور لاکھوں کروڑوں پرندے اس سے سیراب ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

1. Italo Calvino, The New York Review Oct 1986

2۔ فریدالدین عطار، منطق الطیر، ص122

3۔ ایضاً، ص176۔195

4۔ اشتیاق احمد، مشمولہ: علامت کے مباحث، لاہور: بیت الحکمت، 2005ء، ص422

5۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2001ء، ص286

6۔ مستنصر حسین تارڑ، منطق الطیر جدید، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2018ء، ص6

7۔ ایضاً، ص17۔30

8۔ ایضاً، ص106

9۔ ایضاً، ص175۔179

10۔ ایضاً، ص52

11۔ ایضاً، ص61

12۔ ایضاً، ص76

13۔ ایضاً، ص112

14۔ ایضاً، ص130

15۔ ایضاً، ص152

16۔ ایضاً، ص173

17۔ ایضاً، ص161

18۔ 70۔71

19۔ منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور: شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، 2005ء، ص108

20۔ راکھ، ص9

21۔ مطنق الطیر جدید، ص167۔168

22۔ ایضاً، ص80

23۔ ایضاً، ص189